۲ ۱۹/ مارچ ۲۱۵۰ء

نورالحسنین

جان پہچان : نورالحسنین ۱۹/ مارچ ۱۹۵۰ءکو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سیّد نورالحسنین نقشبندی ہے۔ انھوں نے اُردو سے ایم۔اے کیا۔ چند سال تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ بعد میں آ کاش وانی میں اناؤنسر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 'سمٹتے دائرے'، 'مورقص اور تماشائی'، 'گڑھی میں اُترتی شام' اور 'فقط بیان تک' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ 'اہنکار'، 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' اور 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' ناول ہیں۔ اُن کی کتابوں پر کئی انعامات مل چکے ہیں۔ مہاراشٹر اُردو ساہتیہ اکیڈمی نے انھیں 'شاہ سراج اورنگ آبادی ریاستی انعام' سے بھی نوازا ہے۔ نورالحسنین کے ناولوں اور افسانوں میں ماضی کی صدائے بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات اپنے اطراف کی معاشرتی، تہذیبی اور رومانوی زندگی سے اخذ کیے ہیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری بھی اُن کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ہے۔ اُردو میں 'سائنس فکشن' پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

زیر نظر افسانہ '۱۹/ مارچ ۲۱۵۰ء' میں نورالحسنین نے بڑی مہارت سے سائنس اور تکنالوجی کی ارتقائی صورت کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی افسانے میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ کہیں ترقی کے جنون میں ہم پرانے زمانے کی صالح قدروں کو تو فراموش نہیں کرتے جارہے ہیں؟

خضر میاں نے بٹن دبایا اور اسکرین پر ۱۹/ مارچ ۲۱۵۰ء کی تاریخ منہ چڑھانے لگی۔ اُنھوں نے گردن اونچی کی اور ۱۷۵/۷ منزلہ عمارت کے فلیٹ نمبر ایک کی کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اُنھوں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا، آج میری ۱۶۶/ ویں سالگرہ ہے لیکن منانے کے لیے اس وقت کوئی بھی میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں مبارکبادیوں کے پیغامات خوب مل رہے ہیں۔ اُنھوں نے البم کو کلک کیا اور اُن کے سامنے اُن کی بیوی کی تصویر آ گئی اور اُن کے منہ سے نکلا، ''کیا یہ ضروری تھا کہ تم بھی مجھے چھوڑ کر پلوٹو کے شہر زم زم زاں میں ڈاکٹری کرو؟ اور وہ نالائق بھی میری مرضی کے خلاف مریخ کی کسی دور افتادہ بستی میں اپنی بیوی کے ساتھ آباد ہو گیا۔ پورے پندرہ برس ہو گئے اور میں یہاں اکیلا ......'' ابھی اگلا جملہ ان کے دماغ میں آنے ہی والا تھا کہ سامنے کی دیوار میں کچھ چنگاریوں کے مانند تنکے گردش کرنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، وہ عکس دو خوب صورت بچوں میں تبدیل ہو گئے اور اُن کی معصوم آوازیں بلند ہوئیں، ''دادا جان سالگرہ مبارک ہو!''

''تم......؟'' انھوں نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور دونوں بچے اُن کے سینے سے لگ گئے۔ ''تم دونوں اچانک یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''دادا جان! ہم تو چاند پر کھیل رہے تھے کہ دادی اماں کا میسیج ملا کہ آج تمھارے دادا جان کی سالگرہ ہے۔'' بارہ برس کے روشن نے دادا کو چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بتایا اور آٹھ برس کی روشنی نے دادا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''دادی امّاں کا حکم تھا کہ تمھارے دادا اکیلے ہیں۔ سالگرہ کے دن اکیلا رہنا اُنھیں بالکل پسند نہیں ہے۔ جاؤ اور جا کر اُن کی سالگرہ سیلی بریٹ کرو...... اور بس ہم آ گئے۔''

''لیکن تم لوگ تو مریخ......!''

’’دادا جان! چاند پر نیا اسکول قائم ہوا ہے۔ہم نے وہیں پر ایڈمیشن لیا ہے۔‘‘
’’اوہ......!‘‘ خضر میاں نے حیرت سے بچوں کی جانب دیکھا۔
’’دادا جان! آپ ہمارے ساتھ مریخ پر کیوں نہیں رہتے؟‘‘ روشنی نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
’’بھائی! یہ Exit ہونے میں ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے۔خدا نخواستہ ہمارے بدن کے ذرّات ایک جگہ جمع نہ ہوئے تو......؟‘‘
’’دادا جان! اِدھر سے اُدھر Exit ہونے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔بس ایک بار اس کے پروسیس سے گزرنا پڑتا ہے۔‘‘ روشن اپنے دادا کو سمجھانے لگا۔’’یہ ایک بٹن آپ کی کلائی میں لگا دیا جاتا ہے۔یہ دیکھیے ......‘‘ اُس نے اپنی کلائی دادا کے سامنے کردی۔’’بس جب بھی آپ کسی مقام پر جانا چاہیں، اُس شہر کا نام اور کوڈ نمبر کے ساتھ ہی ساتھ پتا بھی اس بٹن میں سیٹ کر دیں، وہ آپ کو وہاں تک پہنچا دے گا۔‘‘
’’نہیں بیٹے! ہم تو یہیں ٹھیک ہیں۔تم لوگوں کی محبت میں اگر یہ رِسک لے بھی لیں تو ہمارا دل اسی زمین میں لگا رہے گا۔‘‘
’’دِل......!‘‘ روشنی نے حیرت سے دادا کی طرف دیکھا،’’دادا جان! یہ دل کیا ہوتا ہے؟‘‘
’’اری بے وقوف! تمھیں دل نہیں معلوم؟‘‘ روشن سمجھانے لگا،’’دل ہمارے بدن میں وہ عضو ہے جس کے چار چیمبر ہوتے ہیں ......‘‘
’’بیٹے! میں اُس دل کی بات نہیں کر رہا تھا جو ایک لوتھڑے کی مانند ہمارے جسم میں ہوتا ہے۔‘‘
’’پھر...... اور دل کیا ہوتا ہے؟‘‘ روشن بھی حیرت سے خضر میاں کی طرف دیکھنے لگا۔
’’دادا جان! کہاں کھو گئے آپ؟‘‘ روشن نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔
’’دادی امّاں نے سالگرہ سیلی بریٹ کرنے کو کہا ہے۔ہم اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر آئے ہیں۔بس ذرا لگیج کا بٹن دبا دیں تو ......‘‘
’’ارے ٹھہرو بچو! اس بار وہ سب رہنے دو۔آج ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ اس زمین پر بیسویں صدی میں سالگرہ کس طرح منائی جاتی تھی۔‘‘ دونوں بہن بھائی حیرت سے دادا جان کی طرف دیکھنے لگے۔
اور خضر میاں اُنھیں بتانے لگے،’’بیٹا! اُن دنوں جس کی بھی سالگرہ ہوتی اُسے سب سے پہلے صبح صبح گرم گرم پانی سے خوب نہلایا جاتا۔‘‘
’’پانی سے نہلایا جاتا تھا؟‘‘ روشن نے دادا کی بات کاٹی،’’وہ اسٹیم باتھ کیوں نہیں کرتا تھا دادا جان؟ اُف کتنا زیادہ پانی ویسٹ ہوتا ہوگا۔‘‘
’’اُن دنوں زمین پر بہت پانی تھا بیٹے۔ ہر گاؤں اور شہر میں ندیاں بہتی تھیں۔
’’پانی کی ندیاں؟‘‘ روشنی نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور خضر میاں سوچنے لگے، بیٹے! تم کیا جانو؟ سنتے ہیں کہ کبھی اس زمین پر تو دودھ کی ندیاں بھی بہتی تھیں۔
’’اور کیا کیا ہوتا تھا دادا جان؟‘‘
’’ایک بڑا سا کیک لایا جاتا۔اُس پر عمر کے مطابق موم بتیاں لگائی جاتیں۔سارا خاندان، دوست احباب جمع ہوتے تھے۔ تالیوں کی گونج اور سالگرہ مبارک کے شور میں کیک کاٹا جاتا اور پھر سب پلیٹوں میں اسے لے کر چمچے سے کھاتے۔‘‘ دونوں بھائی بہن

ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

''پلیٹوں میں لے کر چمچے سے کھاتے تھے!''

''ہاں......اس کے بعد دسترخوان لگتا اور سب مزے مزے کے کھانے کھاتے۔''

''تو آج آپ بھی اپنی سالگرہ اسی طرح منائیں نا دادا جان......'' روشن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''اب تو یہ سب کچھ ممکن نہیں ہے بیٹے۔''

''کیوں......؟''

خضر میاں نے ایک لمبی سانس لی،''اس لیے کہ اُس زمانے میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ اناج پیدا ہوتا تھا اور اسی اناج سے قسم قسم کے پکوان پکائے جاتے تھے۔''

''دادا جان! آپ کتنی حیرت انگیز باتیں ہمیں بتا رہے ہیں۔ یہ کھیتی باڑی کیا ہوتی تھی؟'' روشنی کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

''کھیتی...... بیٹے زمین کا ایک بڑا حصہ ہوتا تھا۔ اس پر کسان ہل چلاتا۔ آسمان سے برسات ہوتی۔ کسان زمین میں بیج بوتا۔ اُس سے پودے اُگتے۔ پھر اُن میں بالیاں لگتیں۔ وہ پکتیں۔ پھر کسان انھیں ایک جگہ جمع کرتا۔ اُن بالیوں سے اناج نکالتا، اسے صاف کرتا اور بوروں میں بھر بھر کر بازار لے آتا۔ لوگ انھیں خریدتے۔ گھروں میں چولہے سلگتے، اُن پر مزے مزے کے کھانے پکتے اور پھر سب پیٹ بھر کھاتے تھے۔''

''تب کتنا مزہ آتا ہوگا......ہے نا دادا جان؟''

''میرے لال! ہم نے بھی یہ سب کچھ بس کتابوں ہی میں پڑھا ہے۔'' خضر میاں بتانے لگے،'' کہتے ہیں کہ اُس وقت آدمی اس طرح فلیٹوں میں مقید نہیں ہوتا تھا۔ ہر فرقہ اپنا ایک مذہب بھی رکھتا تھا اور ہر مذہب نے اپنے ماننے والوں کو خوشیوں کے نام پر کچھ تہوار بھی بخشے تھے۔ جب بھی یہ تہوار آتے پورے ملک میں چھٹی منائی جاتی۔ لوگ ایک دوسرے کے گھر جاتے، ایک دوسرے کو تہوار کی مبارکباد پیش کرتے اور ساتھ مل بیٹھ کر کھانے کھاتے، خوشیاں مناتے تھے۔''

''دادا جان! یہ مذہب کیا چیز تھا؟''

''آہ...... مذہب ایک مکمل ضابطۂ حیات......''

''تو کیا ہماری حیات اب کسی ضابطے کی پابند نہیں ہے؟''

دادا جان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے۔ ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ گویا وہ اُن ضابطوں کو ڈھونڈ رہے ہوں لیکن کوئی سرا اُن کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ ہر سمت انھیں نفسانفسی ہی نظر آ رہی تھی۔ انسانی نسل پورے نظامِ شمسی میں پھیل چکی تھی۔ اب نہ کسی کے پیدا ہونے کی خوشی تھی نہ مرنے کا غم تھا۔ بس تعلقات ایک دوسرے تک پیغاموں میں محصور ہوگئے تھے۔ انھیں یاد آیا، ان کی بیوی نے بھی پلوٹو جانے کی اجازت نہیں بلکہ صرف اطلاع دی تھی۔ اس سائنس اور تکنالوجی کے دور میں دائمی رفاقتیں اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔ اس کے بعد وہ آج تک لوٹ کر نہیں آئی۔ لیکن سوچو تو کون سا کام رُکا ہے؛ کوئی بھی تو نہیں...... اس کی محبت اسی طرح قائم ہے اور اس کے محبت بھرے پیغامات آتے رہتے ہیں۔ لڑکے نے بھی مریخ جانے کی اطلاع پہلے سے نہیں، وہاں پہنچ کر ہی دی تھی۔ بیٹی نے اپنے لیے کوئی ساتھی منتخب کرلیا تھا۔ خدا جانے وہ کس سیارے پر زندگی گزار رہی ہے۔ کوئی غیبی طاقت پورے عالم پر حکومت کر رہی ہے ورنہ کوئی قانون

ہے نہ کوئی گرفت۔ اچھائی اور برائی کی تمیز مٹ چکی ہے۔ جرم اور سزا کا تصور عنقا ہو چکا ہے۔ رشتوں سے نمک اور خلوص سے مٹھاس غائب ہو چکی ہے۔ شاید میں بھی اب وہ نہیں رہا، مجھ میں بھی کہیں ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے اور کیا پتا......

ٹھیک اسی وقت مانیٹر نے دو بجنے کا اعلان کیا اور خضر میاں کو جیسے ایک دم یاد آ گیا اور اُنھوں نے بچوں سے کہا، ''بچو! تم جب سے آئے ہو کچھ نہیں لیا۔ جاؤ......دوسرے کمرے میں کولڈر تیج رکھا ہوا ہے۔ اس میں مختلف کھانوں کے tablets رکھے ہوئے ہیں۔ تمھیں جو بھی پسند ہو، لے لو اور کھا لو۔''

''دادا جان! آج ہم نے بھی طے کیا ہے کہ بھوک مٹانے کی خاطر ہم کوئی ٹیبلیٹ نہیں کھائیں گے۔'' دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

''پھر؟'' خضر میاں نے حیرت کے ساتھ دونوں کی طرف دیکھا۔

''آج آپ ہمیں بیسویں صدی کا کوئی کھانا پکا کر کھلائیں۔''

خضر میاں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میرے بچو! یہ تو اب بہت مشکل ہے۔'' انھوں نے ۱۷۵ منزلہ عمارت سے نیچے کی طرف دیکھا، ''ماضی بہت خوشگوار ہوتا ہے لیکن اسے دوبارہ واپس نہیں لایا جا سکتا۔ یہاں تمھاری سائنس اور تکنالوجی بھی فیل ہو جاتی ہے۔''

روشنی نے کہا، ''دادا جان! ہم ماضی کو واپس نہیں لا سکتے لیکن اس کے تصور میں تو جی سکتے ہیں۔''

''دادا جان! آپ ہمیں اپنا اسٹور روم دِکھایئے تو سہی۔''

خضر میاں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بچوں کے ساتھ اپنے اسٹور روم میں پہنچے اور مختلف ڈبوں اور برتنوں کو کھنگالنے لگے۔ ایک کے بعد ایک ڈبا کھلتا جا رہا تھا اور برسوں پرانی اشیا ماضی کے کواڑ کھول رہی تھیں۔ آخر وہ کسی طرح کچھ مٹھی چاول، مسور کی دال اور کھانا پکانے کے کچھ مسالوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں کھچڑی پک گئی اور اس کی سوندھی سوندھی خوشبو مہکنے لگی۔ خضر میاں نے فرش پر دسترخوان بچھایا، پلیٹوں میں کھچڑی نکالی اور تینوں اُسے کھانے لگے۔ کھچڑی کا مزہ اُن کے چہروں سے عیاں ہو رہا تھا۔ کھاتے کھاتے روشن نے دادا سے پوچھا، ''دادا جان! کیا ہم دوبارہ اس طرح کے کھانے پکا کر نہیں کھا سکتے؟''

خضر میاں نے محبت بھری نظروں سے اپنے پوتے کی طرف دیکھا، ''بیٹے! کھا تو سکتے ہیں لیکن اب کھیتی باڑی کون کرے گا؟''

روشن نے دادا کی طرف دیکھا اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ کہا، ''دادا جان! یہ کام میں کروں گا۔''

خضر میاں نے محبت بھری نظروں سے روشن کی طرف دیکھا۔ عظیم ترین ترقی یافتہ دور کا آدمِ ثانی اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔ اُس کے پُر اعتماد لہجے سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے اُسے پیار سے دیکھا اور بولے، ''میرے لال! آج انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ساری کائنات میں پھیل گیا ہے۔ تمھاری منزل کا راستہ مراجعت میں نہیں بلکہ اُس کہکشاں میں ہے جس کا راستہ تمھیں خود ہی تلاش کرنا ہے۔''

اچانک انھیں خیال آیا کہ بچوں کو واپس بھی جانا ہے۔ اُنھوں نے فوراً کہا، ''بیٹے! اب واپسی کا قصد کرو۔ تمھارے ماں باپ پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''دادا جان! یہ پریشانی کیا ہوتی ہے؟''

’’بیٹے ! یہ بھی میرے دل کی طرح کوئی چیز ہے جسے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔‘‘

دونوں بہن بھائی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کلائی پر لگے ہوئے بٹنوں کو سیٹ کرنے لگے اور پھر پل بھر میں اُن کا وجود بے شمار چنگاریوں میں تبدیل ہوگیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

۱۷۵ منزلہ عمارت کے فلیٹ کی کھڑکی سے لگے خضر میاں آسمان کی طرف دیکھنے لگے......۔

6UVC1Q

****